صفاتِ باری تعالیٰ کے حسین اجتماع کا نام نور ہے۔

ذکر الٰہی سے نور الٰہی ملتا ہے۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 24 / نومبر 1995ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورہ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیت کریمہ تلاوت کی۔

فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۳۷﴾ (النور:37)

پھر فرمایا:۔

نور کے تعلق میں جو خطبات کا سلسلہ شروع ہے یہ بھی اسی کی ایک کڑی ہے۔ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تحریرات کے حوالے سے بعض تشریحات آپ کے سامنے رکھ رہا تھا لیکن اس مضمون کو شروع کرنے سے پہلے جماعت احمدیہ سنگاپور کی درخواست کے پیش نظر یہ اعلان کر رہا ہوں کہ ان کا آٹھواں جلسہ سالانہ آج شروع ہو رہا ہے اور تین دن رہ کر 26 / نومبر کو اختتام پذیر ہوگا۔ صدر صاحب جماعت احمدیہ سنگاپور عبد العظیم صاحب بولیا نے سب کو السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کے تحفے کے بعد یہ درخواست کی ہے کہ ان کو اس جلسے کے کامیابی کے لحاظ سے بھی اور ویسے بھی جماعت سنگاپور کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام اسی آیت کریمہ کی تشریح کرتے ہوئے جو میں نے پہلے پڑھی تھی اور اس کے بعد یہ دوسری ایت اسی کے معاً بعد ہے جو میں نے آج پڑھی ہے۔ حضرت

مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔

’’۔۔۔لفظ عظیم محاورۂ عرب میں اس چیز کی صفت میں بولا جاتا ہے جس کو اپنا نوعی کمال پورا پورا حاصل ہو۔ مثلاً جب کہیں کہ درخت عظیم ہے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ جس قدر طول وعرض درخت میں ہوسکتا ہے وہ سب اس میں موجود ہے اور بعضوں نے کہا ہے کہ عظیم وہ چیز ہے جس کی عظمت اس حد تک پہنچ جائے کہ حیطۂ ادراک سے باہر ہو اور خلق کے لفظ سے قرآن شریف اور ایسا ہی دوسری کتب حکمیہ میں صرف تازہ روی اور حسن اختلاط یا نرمی وتلطف، ملائمت جیسا کہ عوام الناس خیال کرتے ہیں مراد نہیں ہے۔‘‘

(براہین احمدیہ حصہ سوم۔ روحانی خزائن جلد اوّل صفحہ 194)

یہ عبارت ایک مضمون سے دوسرے مضمون میں داخل ہوتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔ اس لئے میں اس کو کھول دوں کہ کیا بحث ہو رہی ہے۔ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام کس پہلو پر روشنی ڈال رہے ہیں۔ آپؑ نے آنحضرت ﷺ کے نور ہونے کی تشریح فرماتے ہوئے یہ بتایا کہ آپؐ کے اخلاق حسنہ بھی نور تھے اور ایسا کامل نور تھے کہ وحیٔ الٰہی کے شعلے کے نزول سے پہلے بھی وہ اخلاق حسنہ فی ذاتہٖ بھڑک اٹھنے اور روشن ہونے پر تیار بیٹھے تھے اور اخلاق کو نور کہنا کن معنوں میں ہے؟ اس کی تشریح حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام دوسری جگہ خدا تعالیٰ کی صفات کے حوالے سے یوں بیان کرتے ہیں کہ اللہ وہ ذات ہے جس کی طرف تمام صفات لوٹائی جاتی ہیں۔ ایک ہی یہ اسم ذاتی ہے جس کے اردگرد تمام صفات بلا استثناء گھومتی ہیں اور اسی سے حوالہ پاتی ہیں۔

پس وہ تمام روشنی کی قسمیں جو مختلف النوع ہیں جب اکٹھی ہو جائیں تو وہ جو روشنی کی ایک اجتماعی شکل ظاہر ہوتی ہے اس کو نور کہا جاتا ہے۔ پس صفات باری تعالیٰ ہی کے ایک حسین اجتماع کا نام نور ہے۔ وہی صفات ایسی ہیں جنہوں نے بندوں پر بھی پرتو فرمایا اور انسانوں کو بھی کچھ ایسی صفات عطا ہوئیں جو ذات باری تعالیٰ میں موجود تھیں ورنہ از خود انسان میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ صفات جب اپنی پوری شان سے جلوہ گر ہوئی ہیں اور ایک ذات میں سب نے اجتماع کر لیا ہے تو وہ محمد مصطفی ﷺ کا وجود ہے جس میں یہ تمام صفات اکٹھی ہوئیں اور پھر اپنے درجہ کمال کو پہنچ گئیں۔ یہ نور ہے پس یہ نہ

سمجھیں کہ غلط مبحث ہو گیا ہے بات کچھ شروع ہوئی تھی اب کہیں اور جا پہنچی ہے۔نور ہی کو سمجھانے کے لئے یہ باتیں بتائی جارہی ہیں۔نور کا اس ظاہری آنکھ سے بھی ایک تعلق ہے اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ جو چیز چمکتی ہوئی دکھائی دے وہی نور ہے حالانکہ جو چمکنے والی لہریں جو نور کہلاتی ہیں ان کی نوعیت بھی ایسی ہے کہ ان کا اکثر حصہ آنکھ سے دکھائی دے ہی نہیں سکتا۔وہ بہت زیادہ ہے جو دکھائی نہیں دیتا جو دکھائی دیتا ہے وہ اس نوع میں سے بھی بہت کم ہے۔

پس آنکھ سے نور کا تعلق ایک سرسری تعلق ہے یا یوں کہنا چاہئے سرسری نہیں تو محدود ہے اور نور اس کے علاوہ ایسا بھی ہے کہ جو چمکتا دکھائی نہیں دیتا۔پس نورِ نظر جس سے باہر کا نور دکھائی دیتا ہے وہ بھی کسی کو چمکتا دکھائی نہیں دیتا۔بعض دفعہ زندہ انسانوں کی کھوپڑیاں بھی اتار دی جاتی ہیں اور دماغ اسی طرح کام کرتا ہوا نظر آتا ہے اور کہیں کوئی چمک دکھائی نہیں دیتی۔تو نور کا چمک کے ساتھ جو تعلق ہم نے باندھ رکھا ہے یہ اپنے محدود تجربے کی وجہ سے ہے ورنہ نور کا چمک سے براہ راست کوئی لازمی تعلق نہیں ہے اگر ہے تو ہم اسے نہیں سمجھ سکتے۔ہماری آنکھوں کو وہ صلاحیت عطا نہیں ہوئی کہ نور کی ہر قسم کو چمکتا ہوا دیکھ لیں۔پس اکثر نور ہماری نظر سے اوجھل رہنے والے نور ہیں لیکن جب ان کو دوسرے مضامین میں ڈھال کر دیکھیں تو عقل کا نور انہیں دیکھنے لگ جاتا ہے۔یہی ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمارے لئے آسان کر کے بیان فرما دیا۔یعنی نور کی وہ تشریحات بیان فرمائیں جن کو عقل کا اجتماعی نور دیکھتا اور پہچانتا ہے اور اس کی چمک دمک کو محسوس کرتا ہے۔اگر چہ ظاہری آنکھ کا وسیلہ بیچ میں کوئی نہیں ہے۔ظاہری آنکھ سے نہیں دیکھا جارہا اور وہ صفات کا نور ہے۔

پس صفات کے نور کو نور کہنے کے لئے بنیادی دلیل کیا ہے وَہ یہ قائم فرمائی ہے کہ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (النور: 36) اللہ زمین و آسمان کا نور ہے اور اللہ کیا ہے ؟ اللہ صفات حسنہ کے مجموعے کا نام ہے۔وہ صفات حسنہ باری تعالیٰ جو دائمی ہیں اور جن کے اجتماع سے خدا بنتا ہے، ان میں سے ایک بھی نہ زائل کی جاسکتی ہے نہ باطل کی جاسکتی ہے، نہ وقتی طور پر ہٹائی جاسکتی ہے، نہ اس میں کوئی کمی کی جاسکتی ہے اور زیادتی کی گنجائش ہی کوئی نہیں کہ وہ پہلے ہی درجہ کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔تو یہ اگر نور ہے تو انسانوں نے نور بننا ہو تو کیسے بنیں۔اگر یہ نور ہے تو پھر اس نور کو اپنانے کے لئے انسانوں کو بھی تو کوئی راہ دکھائی گئی ہوگی۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں کہ وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی راہ ہے جو دکھائی گئی ہے۔ آپؐ کو وسیلہ بنایا گیا ہے۔ پس محض نور نور کہہ کر یہ نہ سمجھو کہ تمہارے دل یہ بار بار کہنے سے ہی روشن ہو جائیں گے۔ سمجھو تو سہی کہ کیا کہہ رہے ہو اور دیکھو یہ نور تمہارے اندر آ بھی سکتا ہے کہ نہیں۔ آ سکتا ہے تو کیسے؟ اگر تمہاری استطاعت میں نہیں تھا تو خدا یہ کیوں کہتا کہ یہ وسیلہ بنا دیا گیا ہے۔ تم میں سے ہر ایک کی استطاعت میں ہے کہ وہ حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کے نور سے روشن ہو جو اوّل طور پر اللہ کا نور ہے اور آپؐ کی ذات میں اس حد تک جلوہ گر ہوا ہے جس حد تک انسان میں یہ صلاحیت ہے کہ خدا کے نور کو اپنی ذات میں سمو سکے اور اس کا جلوہ انسان کی صفات میں ظاہر ہو۔ پس اس مضمون کو بیان کرتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ لکھا جو میں نے آپ کو پڑھ کر سنایا۔

اور یہ عظیم کی بحث یوں چلی ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم:5) کہ اے محمد ﷺ تو خلق عظیم پر واقع ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں کہ عظیم لفظ کیا ہے پہلے اس کو تو سمجھو۔ عظیم اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے استعمال ہوا ہے۔ درختوں کو بھی عظیم کہہ دیا جاتا ہے۔ دریاؤں کو بھی عظیم کہہ دیا جاتا ہے۔ پس عظیم، پہلی بات تو یہ ہے کہ تقابلی لفظ نہیں ہے جیسے ہم اکبر کہہ دیتے ہیں۔ اکبر کا مطلب ہے سب سے بڑا۔ عظیم میں کوئی مقابلہ ذہن میں نہیں آتا مگر اس کی ذات میں بے حد بڑا ہونا شامل ہے۔ اس تعریف کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کھول رہے ہیں کہ جب کہا گیا کہ وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ تو آنحضرت ﷺ کے اخلاق کے متعلق ہم کیا تصور باندھیں، کیا تھے؟ فرماتے ہیں:

> ”عظیم محاورہ عرب میں اس چیز کی صفت میں بولا جاتا ہے جس کو اپنا نوعی کمال پورا پورا حاصل ہو۔“

اب دیکھ لیں اپنا نوعی کمال کہہ کے کئی جھگڑے نپٹا دئے۔ خدا بھی عظیم، درخت بھی عظیم، بندہ بھی عظیم، پہاڑ بھی عظیم۔ فرمایا لفظ عظیم میں تو تقابل ہے ہی نہیں۔ اپنا ذاتی کمال اس حد تک پہنچ جائے کہ اس سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔ تو ہر چیز جو ایک خاص حالت پر تخلیق ہے اس کے اندر اس کی صلاحیتیں اس طرح تخلیق کی گئی ہیں کہ ان کی حدیں بھی معین کر دی گئی ہیں۔ وہ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ

عَلٰی شَاکِلَتِہٖ (بنی اسرائیل:85) کے لفظ میں شَاکِلَتِہٖ کے تابع بیان فرمایا گیا ہے کہ ہر چیز کی شَاکِلَتِہٖ بنادی گئی ہے۔اس شَاکِلَتِہٖ کے اندر رہتے ہوئے وہ عمل کرسکتا ہے اس سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔پس ہر چیز کو ہم عظیم کہتے ہیں اس کی شَاکِلَتِہٖ کے تعلق میں کہتے ہیں، اس کے حدود اربعہ کے تعلق میں کہتے ہیں جو حدود اربعہ خدا تعالیٰ نے اس کے لئے مقرر فرما دیا ہے اور ایک ہی ذات ہے جس کا کوئی حدود اربعہ نہیں ہے۔مرضی اللہ کی ذات۔پس وہاں عظیم لا انتہا، غیر متناہی جس کی کوئی حد نہیں ہے، کوئی بس نہیں اور انسانوں پر یا دوسری مخلوقات پر یہ لفظ جب صادق آئے گا تو ان میں جتنا بھی بڑے ہونے کی طاقت موجود ہے یا صلاحیت عطا کی گئی ہے اس حد تک کوئی پہنچ جائے تو اسے کہتے ہیں عظیم ہے اور وہ حد بسا اوقات ایسی ہوتی ہے کہ عام آدمی اپنے نظر سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ پہاڑ بھی عظیم کہلاتے ہیں مگر ایک ملک کا پہاڑ بھی عظیم کہلاتا ہے ایک دوسرے ملک کا پہاڑ بھی عظیم کہلاتا ہے اور جب ہم پہاڑ کے دامن میں جا کر اس کی عظمت کا نظارہ کرتے ہیں تو بیک وقت اس سارے پہاڑ کی عظمت کا احاطہ نہیں کر سکتے۔پس عظمت میں جو نسبتاً ادنیٰ درجہ کے دیکھنے والے ہیں اس احاطے کا امکان نہیں ہوتا ممکن ہی نہیں ہوتا ادنیٰ درجے سے دیکھنے والوں کے لئے کہ وہ اس کا احاطہ کرسکیں۔

پس آنحضرت ﷺ چونکہ نوع انسانی میں اس درجۂ کمال پر واقع ہوئے ہیں جہاں نوع انسانی کی آخری حد تھی۔اس لئے آپ کے حوالے سے عظیم کا مطلب حضرت مسیح موعود علیہ السلام یہ ثابت فرما رہے ہیں کہ اخلاق جس حد تک بھی انسان کی شاکلہ میں ڈھل کر وسیع ہو سکتے تھے اور روشن ہو سکتے تھے۔وہ سارے آپؐ کی ذات میں روشن ہو گئے اور اس کا احاطہ بندہ نہیں کرسکتا کیونکہ جو ادنیٰ حالت پر واقع ہے وہ اس عظمت کو اپنے ادراک کے دائرے میں نہیں لا سکتا۔اس لئے اللہ ہی تھا جو گواہی دے سکتا تھا اور اللہ ہی ہے جس نے گواہی دی ہے اور یہ گواہی کسی اور کے لئے نہیں دی گئی،

پس یہ وہ نور ہے جس کو سمجھنا ہے اور پھر نور کی تعریف کرنی ہے تو نور مانگنا بھی تو ہے۔نور اپنانا بھی تو ہوگا اور ہر نور کے اپنانے کے لئے کتنے لمبے فاصلے طے کرنے ہیں، کتنی محنتیں اور مشقتیں کرنی ہیں، پھر نور کمایا جائے گا۔ورنہ فطرت میں موجود رہنے کے باوجود جب تک دوسرے نور سے جو باہر سے آ کر فطری نور پر پڑتا ہے تعلق قائم نہ ہو جائے اس وقت تک اندر کا نور بھی اندھا ہی رہتا

ہے۔چنانچہ آنکھ کے اندھے نہ بھی ہوں اگر روشنی سے محروم ہوں تو آنکھ کے اندھوں کی طرح ہی ہوتے ہیں ۔روشنی کے بغیر ان کو کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔پس آنحضرت ﷺ کی عظمت کو سمجھنے کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام کی آنکھ سے دیکھنا ضروری ہے کیونکہ اللہ نے آپؑ کو حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کے تمام تر جلوے سے اس طرح فیض یاب ہونے کی توفیق بخشی جیسا کہ چاند کو توفیق ہوتی ہے کہ سورج کی روشنی کو اپنے اندر لے اور آگے منعکس کرے۔پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آنکھ سے جب دیکھا جائے تو محمد رسول اللہ ﷺ کیا دکھائی دیتے ہیں یہ ہے مضمون جو میں آپ کو سمجھا رہا ہوں۔نور ہی نور ہیں مگر کن معنوں میں نور ہیں۔فرماتے ہیں۔

”۔۔۔بعضوں نے کہا ہے کہ عظیم وہ چیز ہے جس کی عظمت اس حد تک پہنچ جائے کہ حیطۂ ادراک سے باہر ہو اور خلق کے لفظ سے قرآن شریف اور ایسا ہی دوسری کتب حکمیہ میں صرف تازہ روی اور حسن اختلاط یا نرمی و تلطّف، ملائمت (جیسا کہ عوام الناس خیال کرتے ہیں) مراد نہیں ہے۔۔۔“

اب ایک فقرہ بھی سمجھانے کے بغیر عام قاری کو سننے والے کو سمجھ نہیں آسکے گا۔اس لئے کہ ایک تو جتنا مشکل مضمون ہو اتنی زبان میں ساتھ مشکل ہوتی چلی جاتی ہے اس کے مناسب حال زبان استعمال کرنی پڑتی ہے اور اردو کا عام معیار ایسا نہیں ہے کہ علمی اصطلاحوں کو یا گہرے مشکل الفاظ کو جو زیادہ علم سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں ان کو آسانی سے سمجھ سکے۔پس اس لئے آہستہ روی بھی ضروری ہے صرف تازہ روی نہیں۔حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:”دوسری کتب حکمیہ میں صرف تازہ روی“ اب تازہ روی سے کیا مراد ہے۔ایک انسان کسی انسان سے ملتا ہے تو اسے تازگی کا احساس ہوتا ہے اور ایک انسان سے ملتا ہے تو بوسیدگی کا احساس ہوتا ہے۔اس کے چہرے پر ہی نحوست سی آئی ہوتی ہے اور اس کو مل کر طبیعت میں بشاشت نہیں پیدا ہوتی۔پھر تازگی جیسے پھولوں کی تازگی، جیسے بہار کی تازگی ہے جو ہر نباتات پر ظاہر ہو جاتی ہے۔اسی طرح تازگی بھی نسبتاً کم اور نسبتاً زیادہ ہوا کرتی ہے۔موسم بہار کی تازگی ہر چیز کو سمیٹ لیتی ہے۔پس آپ کی چال ڈھال، آپ کی ہر حرکت اور سکون میں بھی لیکن لفظ روش کا استعمال ہوا ہے اس لئے یوں کہنا چاہئے آنحضرت ﷺ کے اخلاق جو آپ کے چہرے اور بشرے سے ظاہر اور باہر تھے جو ہر وقت متحرک دکھائی دیتے تھے ان میں تازگی پائی

جاتی تھی، کوئی تھکن نہیں تھی، کوئی بوجھ نہیں تھا۔ نہ اپنی ذات میں محسوس فرماتے تھے، نہ ملنے والے کو کچھ محسوس ہوتا تھا۔ تو یہ تعریف تو عمومی فرما رہے ہیں لیکن حوالہ چونکہ آنحضرت ﷺ کا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ یہ تمام صفات جن کی تشریح حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرما رہے ہیں یہ رسول اللہ ﷺ کی ذات میں ثابت تھیں۔

''اور حسن اختلاط'' ملنے جلنے کا بھی ایک انداز ہوا کرتا ہے۔ بھونڈا پن بھی اس میں ہوتا ہے کہیں توازن کھو دیتا ہے تو حد سے زیادہ بے تکلفی، کہیں توازن کھو دیتا ہے تو بہت ہی دوری اور اجنبیت۔ یہ ساری چیزیں اختلاط کے حسن کے مخالف ہیں۔ اختلاط کا حسن یہ ہے کہ ملنا، اس طرح ملنا کہ اپنی ذات کو الگ قائم رکھتے ہوئے بھی، اپنی ذات کو دوسرے کی ذات میں گھلا ملا دینا مگر اس طرح کہ وقار قائم رہے اور یہ جو ملنا جلنا ہے اس میں گھٹیا پن دکھائی نہ دے اور اختلاط ایسا نہ ہو جو خدا تعالیٰ کی قائم کردہ حدود سے تجاوز کر جائے۔ وہاں تک چلے جہاں تک اجازت ہے۔ وہاں ٹھہر جائے جہاں آگے بڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ تو اختلاط بھی ایک خلق کا نام ہے اور اس کو بھی اس میں داخل فرمایا ہے کہ کتب حکمیہ میں فرماتے ہیں، جو حکمت کی کتب ہیں ان میں لکھا ہے یہ اخلاق ہوتے ہیں۔ خلق اس کو کہتے ہیں کہ تازہ روی ہو حسن اختلاط ہو ''نرمی و تلطف، ملائمت'' یعنی نرمی اور لطف کا سلوک کرنا اور ملائمت کہ بات کھردری محسوس نہ ہو۔

''۔۔جیسا عوام الناس خیال کرتے ہیں مراد نہیں ہے بلکہ خلق بفتح خا
اور خلق بضم خا دو لفظ ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل واقع ہیں۔۔۔''

جیسا عوام الناس خیال کرتے ہیں مراد نہیں ہے۔ یہ مطلب بنے گا کہ قرآن کریم میں یہ جو باتیں بیان ہوئی ہیں اس کا جو مفہوم عوام الناس لیتے ہیں وہ درست نہیں ہے۔ بات درست ہے قطعی طور پر، اگر قرآن نے بیان کی ہے تو اس کے غیر درست ہونے کا تصور ہی نہیں پیدا ہو سکتا پھر اس بریکٹ کا یہ مطلب بنا کہ اس کا جو معنی عامۃ الناس سمجھتے ہیں وہ درست نہیں ہے۔ میں اب تفصیل سے بتاتا ہوں کہ وہ معنی کیا ہے۔ اس مضمون میں داخل ہوتے ہوئے آپ نے خلق اور خلق دو الفاظ کو الگ الگ پیش کر کے ان کے معانی کو ہمیں سمجھا دیا اور فرمایا کہ جب خلق کہا جاتا ہے تو یہ مطلب ہوتا ہے، خلق کہا جائے تو یہ مطلب ہوتا ہے اور جو تعریف حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرما رہے ہیں خلق کی

یہ جو پہلی تعریف تھی اس معانی کے مطابق ہوگی نہ کہ عامتہ الناس کی سوچ کے مطابق۔ اب یہ مضمون کچھ مشکل ہو جاتا ہے لیکن لازم ہے کہ اس کو سمجھا جائے۔ ہر بندے کا نہ صرف یہ کہ حق ہے بلکہ فرض ہے کہ اس مضمون کو سمجھے کیونکہ اس کا نور سے اتصال ہونا اس کے فرائض دینیہ میں داخل فرما دیا گیا ہے، اس کی پیدائش کی غرض وغائیت میں داخل فرما دیا گیا ہے۔ اس لئے دقت خواہ زیادہ ہی ہو آپ کو یہ بات لازماً سمجھانی ہوگی۔ آنحضرت ﷺ کو وسیلہ کہہ کر، وسیلہ مان کر، وسیلہ یقین کرتے ہوئے ہم وہیں کھڑے رہ جائیں تو آپؐ وسیلہ نہیں بن سکتے۔ وہ وسیلہ کس صراط مستقیم کا نام ہے۔ اس میں کتنی راہیں چل رہی ہیں۔ بعض چھوٹی راہیں صراط ہوتی ہیں جن میں دو Lanes چلتی ہیں بعض میں تین Lanes کی سڑک بن جاتی ہے۔ بعض دو رویہ ہو جاتی ہیں۔ چھ چھ سات سات Lanes کی دو رویہ سڑکیں بھی دوڑتی ہیں، مگر محمد رسول اللہ ﷺ کی جو صراط مستقیم ہے اس میں وہ ساری سڑکیں ہیں جن کا ذکر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام آگے چل کر خلق کی تعریف میں بیان فرمائیں گے اور ہر سڑک پر قدم رکھنے کے لئے، ہر سڑک پر رسول اللہ ﷺ کے قدموں کی پیروی کے لئے ایک مناسب صفت ہمیں عطا ہوئی ہے۔ اس لئے پورا قافلہ ہے جو آگے بڑھے گا۔ تمام انسانی صفات وہی ہیں جو آنحضرت ﷺ کو عطا ہوئی تھیں صرف درجۂ کمال کا فرق ہے اور ان صفات کو جس درجے پر بھی وہ واقع ہیں روشن کرنے کے لئے بے حد گنجائش موجود ہے کیونکہ بہت سی ایسی صفات ہیں جو ہمارے اندر موجود ہیں جن کی ہم نے کبھی پرورش ہی نہیں کی۔ عدم استعمال کی وجہ سے مر جاتی ہیں۔ وہ اعضاء جو حیوانوں کو ملے ان میں سے کئی اعضاء ایسے ہیں جن کا استعمال جب انسان کی سطح تک پہنچتے پہنچتے زندگی نے چھوڑ دیا تو وہ اعضاء سکڑ کر بالکل معمولی سے رہ گئے۔ ان کے نشان باقی ہیں۔ ریڑھ کی ہڈی کی جو دمچی ہے وہ جگہ ہے جہاں دم لگی ہوئی تھی اور لاکھوں سال سے انسان کو دم کی ضرورت پیش نہیں آئی اس لئے رفتہ رفتہ وہ دمچی ایک چھوٹی سی ہڈی کے نشان کے طور پر، ایک یادگار کے طور پر رہ گئی۔ تو بسا اوقات انسان اپنی صلاحیتوں کو اپنی ریڑھ کی ہڈی کی دمچی بنا دیتا ہے، استعمال ہی نہیں کرتا، ان کی نشو ونما ہی نہیں ہوتی وہ پڑے پڑے سوکھ جاتی ہیں۔ ٹانگیں سوکھ جاتی ہیں اگر ان کو استعمال نہ کریں۔ ایک بچے کو گود میں اٹھائے پھریں وہ لولہ لنگڑا ہو جائے گا۔ اس کی ربڑ کی سی ٹانگیں لٹکی رہیں گی۔ کبھی بھی وہ ان کو استعمال نہیں کر سکتا۔ مگر رہتی ہیں مگر جب حد سے زیادہ تغافل ہو جائے اور لمبا

عرصہ ہو جائے تو گویا وہ مٹ ہی جاتی ہیں مگر ان کے نشانات باقی رہ جاتے ہیں یہ بتانے کے لئے کہ اللہ نے تمہیں کیا دیا تھا۔ پس وہ قومیں جو بدنصیبی سے ہزاروں سال تک بداخلاقی پر قائم رہتی ہیں ان کا یہی حال ہو جاتا ہے۔

پس ہم نے تو ویسا نہیں بننا۔ ہمیں تو آنحضرت ﷺ کا نمونہ عطا کر کے ہماری ہر صلاحیت کو پیروی کی راہیں دکھا دی گئیں ہیں اور ایک عظیم صراط پر دوڑا دیا گیا ہے اور کہا ہے سب کو ساتھ لے کر چلو۔ جہاں بھی کسی صفت کو تم نے کالعدم کر دیا یا توجہ، جیسا کہ حق ہے نہ دی اس حد تک تم رسول اللہ ﷺ کے توازن کے حسن سے محروم ہوتے چلے جاؤ گے۔ روشنی تو ہے اگر روشنی کی پیروی کی جائے مگر جہاں سب رنگوں کا امتزاج ہو جہاں تمام رنگ بیک وقت ایک تناسب سے جلوہ گری کریں وہاں اس سے جتنا بھی وہ روشنی ہٹے گی اس حد تک اس روشنی کا رنگ روپ بدل جائے گا۔ اب سورج کی روشنی اپنی ذات میں وہ کامل توازن رکھتی ہے جو مادی روشنیوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے۔ جتنا آپ اس سے ہٹتے ہیں اتنا ہی روشنی کا روپ بدلتا رہتا ہے اور اگر آپ موازنہ نہ کریں تو بعض دفعہ ہمیں خیال بھی نہیں آتا کہ فرق ہے۔ رات کے وقت تیز روشنیاں جل رہی ہیں بھول جاتا ہے انسان کہ اس روشنی کا سورج کی روشنی سے کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ جب سورج چڑھے پھر ساری روشنیاں پھیکی پڑ جاتی ہیں۔ ان کے چہرے پر کوئی نور دکھائی نہیں دیتا۔

پس محمد رسول اللہ ﷺ کو سورج کہنا ان معنوں میں ہے کہ ایسے کمال کے اخلاق ہیں، ایسے آخری مقام تک پہنچے ہوئے ہیں، درجۂ منتہا تک کہ جب آپ کا سورج طلوع ہو تو ہر نور والے کا چہرہ اس کے مقابل پر پھیکا پڑ جاتا ہے یا جس حد تک وہ خام ہے، جس حد تک اس نور کی بعض صفات سے عاری ہے اس حد تک اس کا رنگ بدل جاتا ہے۔ ویسی روشنی دکھائی نہیں دیتی۔ پس اللہ تعالیٰ کا یہ امت محمدیہ پر بہت بڑا احسان بھی ہے کہ ایسا کامل نور پیروی کرنے کے لئے عطا فرمایا لیکن ذمہ داریاں بھی بہت بڑھ گئیں، محنت بھی بہت شاقہ ہے جو کرنی پڑے گی لیکن آسان بھی تبھی ہو گی اگر آنحضرت ﷺ کے نور کے اس پہلے حصے پر غور کریں جس سے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام نے صفات کے بیان کا آغاز فرمایا ہے۔ ''تازہ روی''۔ تازہ روی کے بغیر اس نور کی پیروی ممکن ہے نہ ہمارے اندر طاقت ہے بلکہ برعکس صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا دیکھو دین کو

آسان کر دیا گیا اور اگر آسان ہونے کے باوجود تم کوشش کر کے دین پر غالب آنا چاہو گے تو تم ٹوٹ جاؤ گے، دین پر تم غالب نہیں آ سکتے۔ اس لئے وہی لفظ جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اخلاق کی تعریف میں سب سے پہلے استعمال فرمایا آنحضرت ﷺ اسی مضمون کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں حسب توفیق کچھ صبح چلا کرو، کچھ دوپہر کو، کچھ آرام کر لیا کرو، جیسے درخت کے سائے تلے ایک مسافر آرام کر لیتا ہے پھر شام کو سفر طے ہوتا رہے گا۔ تم آگے ہی بڑھو گے غرضیکہ کچھ آرام اور کچھ حرکت اس کے درمیان رفتہ رفتہ تمہارے فاصلے کم ہوں گے لیکن ضروری یہ ہے کہ ہر رات جو آئے تمہیں پہلی حالت پر نہ پائے بلکہ اس سے آگے بڑھا ہوا دیکھے۔ ہر دن جو چڑھے وہ تمہیں پہلی حالت پر نہ پائے بلکہ اس سے آگے بڑھا ہوا دیکھے۔

آنحضرت ﷺ کی پیروی میں جو سفر ہم نے اختیار کیا ہے یہ نور کی پیروی کا سفر ہے اور ہر روز ہماری حالت بدلنی چاہئے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے جس نور ازل کی پیروی کا سفر اختیار فرمایا اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى (الضحیٰ:5) یقیناً تیری آخرت تیرے اولیٰ سے بڑھ کر ہے، بہتر ہے، تو وہ سفر بھی دائمی ہے۔ اس کے پیچھے چلنے والوں کا سفر بھی دائمی ہے۔ مگر سفر طے ہونے کے لئے ایسے سنگ میل راستے میں ملتے ہیں جن سے پتا چل جاتا ہے کچھ آگے بڑھے بھی کہ نہیں بڑھے اور وہ سنگ میل طے نہیں ہو سکتے جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق حسنہ پر ایک تفصیلی یا عمومی نظر نہ ہو۔ تفصیلی نظر کی تو کوئی انتہا نہیں۔ خلاصہ جو مسیح موعود علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے وہی اتنا دقیق ہے کہ اسے بیان کرتے ہوئے بھی ایک مدت چاہئے مگر چونکہ ایک لازم کام ہے اس کو سمجھے بغیر ہمارے سفر آسان نہیں ہو سکتے۔ ہم اس رخ پر آگے نہیں بڑھ سکتے اس لئے یہ فرض جو بہر حال ادا کرنا ہوگا۔

فرماتے ہیں خلق یفتح ،خا سے مراد، فتح کہتے ہیں زبر کو توخ کے اوپر اگر زبر ڈالی جائے تو خلق پڑھا جائے گا۔

> ’’۔۔۔خلق بفتح خا سے مراد یہ صورت ظاہری ہے جو انسان کو حضرت واہب الصور اس ذات کی طرف سے عطا ہوئی۔‘‘

(براہین احمدیہ حصہ سوم۔ روحانی خزائن جلد اوّل صفحہ 194)

وہ ظاہری شکل ہے۔انسانی جسم کی ساخت جو واہب الصور اس ذات کی طرف سے عطا ہوئی ہے جو صورتیں عطا فرمانے والی ذات ہے جو صورتیں بخشنے والی ذات ہے جس کا ایک نام مصور بھی ہے تو فرمایا اس نے جو ظاہری شکل عطا فرمائی ہے۔ظاہری شکل سے مراد یہ مراد نہیں ہے جو ہمیں دکھائی دے رہی ہے۔مراد ہے جسمانی شکل جو اندر بھی ہے، باہر بھی ہے اور ہر جزو میں ہے اور ہر جزو کی شکل کا تعلق کل سے بھی ہے اور ہر دوسرے جزو سے بھی ہے تو یہ مضمون ہے کہ ہمیں کون سی صورعطاء کی گئی ہیں یہ قرآن کریم سے پتا چلتا ہے کہ اپنی ذات میں ایک بہت لمبا سفر ہے۔

هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ (آل عمران:7)

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے دیکھا کرو غور کرو ہم تمہیں رحموں کے اندر کیا کیا صورتیں بخشتے ہیں اور رحموں کے اندر جو صورتیں بخشتے ہیں ان کے متعلق سائنس دانوں اور ہمیں یہ کہہ کر اس سفر کو ہی لامتناہی بنا دیا، سائنس دان کہتے ہیں کہ زندگی کا پہلا ذرہ جو پیدا ہوا ہے اس وقت سے لے کر ایک ارب سال کا سفر جو ارتقاء کا سفر ہے جس میں انسان ٹھیک ٹھاک کیا گیا ہے۔مٹی سے بنا کر اس ایک ارب سال کے سفر میں انسان جن جن شکلوں سے گذرا ہے وہ ساری شکلیں نو مہینے کے اندر رحم مادر میں دہرائی جاتی ہیں اور ایک فلم چل جاتی ہے جو ایک ارب سال کا سفر بچہ نو مہینے میں طے کر رہا ہے اور قرآن کے سوا کوئی دنیا کی کتاب نہیں ہے جو یہ کہتی ہو کہ رحم مادر میں ہم نے تمہیں جو تصویریں دی ہیں دیکھو تو سہی۔تم یونہی تو نہیں بن گئے کہ مٹی سے تھوپ تھاپ تمہیں ایک گڈا سا بنا کے کھڑا کر دیا ہے، بے وقوفی کی بات ہے۔ان نو مہینے کا سفر اگر تم کر لو تو تمہیں یہ پتہ چل جائے گا کہ ہم نے تمہیں کتنی دیر میں کتنے مراحل سے گزار کر وہ صورت بخشی ہے جس پر تم اب فخر کرتے ہو کہ کیسی اچھی صورت ہے۔

تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام جب واہب الصور کی بات کرتے ہیں تو جمع کا صیغہ استعمال فرمایا ہے صور۔صورتوں کے بخشنے والے نے گویا انسانی صورت کے اندر یا اس کے ماضی میں جتنی صورتیں بھی انسان کو عطا ہوتی رہیں یہ خلق ہے یفتح خاء۔

''جس صورت کے ساتھ وہ دوسرے حیوانات کی صورتوں سے ممیّز ہے۔۔۔''

یہ آخری شکل ہے اس کی۔

’’۔۔۔اور خلق بضم خا سے مراد وہ صورت باطنی یعنی خواص اندرونی ہیں جن کی رو سے حقیقت انسانیہ، حقیقت حیوانیہ سے امتیاز کلی رکھتی ہے۔۔۔‘‘

اب جہاں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام امتیاز کی بات کر رہے ہیں وہاں صرف انسان کی صورت پر آ کر جو ہر عضو اور ہر ذرہ درجہ کمال کو پہنچ گیا ہے وہاں اس وقت کی بات کر رہے ہیں مگر میں نے قرآن کے حوالے سے آپ کو بتایا تھا کہ ان صورتوں سے پہلے بھی ایک بہت لمبا صورتوں کا سفر موجود ہے۔ یہ جو موجودہ آخری صورت ہے یہ وہ ہے جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے ورنہ انسان کی صورت میں اور حیوان کی صورت میں مشابہتیں ہیں تو سہی مگر امتیاز بھی ہے۔ فرمایا یہ ہے خلق اور انسان کی خَلق، خَلق ظاہر جو اس کے بدن سے تعلق رکھتی ہے۔ فرمایا ایک اس کو خُلق عطا ہوا ہے خلق کیا ہے؟ خلق، ان اندرونی صفات کا نام ہے جو انسان کو عطا ہوئیں اور ان صفات کے لحاظ سے باقی جانوروں سے وہ ممتاز اور الگ ہے اور کوئی جانور یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے بھی اس نوع کی یہ صفت ملی ہوئی ہے اس سے ملتی جلتی تو ہیں۔ جیسا کہ جنت میں جو خدا ہمیں تحائف عطا فرمائے گا ہمیں کچھ ملتا جلتا دکھائی دے گا تو ہم کہیں گے نا کہ ہم نے پہلے بھی کھایا ہوا ہے۔ اللہ فرمائے گا۔ نہیں ملتی جلتی ہیں۔ تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ملتی جلتی صفات کا انکار نہیں فرما رہے اس غلطی میں نہ مبتلا ہو جائیں۔ فرمایا ہے، ملتی جلتی ہونے کے باوجود جب انسان کے درجہ پر پہنچ کر وہ خلق ظاہر ہوتا ہے جو خالصۃً انسان کو عطا ہوا ہے تو وہ خلق کسی اور جانور کو نہیں ملا اور وہاں انسان ہر دوسرے جانور سے الگ اور ممتاز ہو جاتا ہے۔ پھر فرماتے ہیں:

’’۔۔۔پس جس قدر انسان میں من حیث الانسانیت اندرونی خواص پائے جاتے ہیں اور شجرہ ءِ انسانیت کو نچوڑ کر نکل سکتے ہیں۔۔۔‘‘

اب انسانیت کا شجرہ کیا ہے۔ وہ تمام صفات حسنہ جو خلق کے طور پر انسان کو ودیعت ہوئی ہیں اور وہ صفات حسنہ جو دوسرے جانوروں اور اس کے درمیان ایک امتیاز قائم کر دیتی ہیں وہ اگر انسان کو نچوڑا جائے تو جو خلاصہ نکلے گا اس کا نام خلق ہے۔ وہ روح انسانی ہے کیونکہ خلاصے اور نچوڑ کو بھی روح کہا جاتا ہے اور امر واقعہ یہ ہے کہ روح بھی اسی سے بنے گی۔ مرنے کے بعد جس روح کو ایک آزاد حیثیت عطا ہوگی وہ انسانی خلق سے ہی بنے گی اور وہ خلق اگرچہ آغاز میں حسین دیا گیا تھا جو

جس حد تک اس خلق کو بگاڑے گا اسی حد تک اس کی روح بدصورت اور بدزیب اور بدمزہ ہوتی چلی جائے گی اور وہ روح جو پیدا ہوگی وہ انسان کے اپنے گناہوں، اپنے ظلم کے نتیجے میں پیدا ہوگی اس کی ذمہ داری خدا تعالیٰ پر نہیں ہے تو فرمایا کہ اس شجرہ کو اگر نچوڑ کر دیکھیں تو جو کچھ اس کا پھل تم پاؤ گے وہ خلق ہے۔ ''جو کہ انسان اور حیوان میں من حیث الباطن مابہ الامتیاز ہیں''۔ یہ ساری باتیں وہ ہیں جو باطنی طور پر انسان اور حیوان میں ایک امتیاز قائم کرتی ہیں ''ان سب کا نام خلق ہے۔''

''۔۔اور چونکہ شجرہ فطرت انسانی اصل میں توسط اور اعتدال پر واقع ہے اور ہر وقت افراط و تفریط سے جو قویٰ حیوانیہ میں پایا جاتا ہے منزہ ہے۔ جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (التین:5)۔۔''

(براہین احمدیہ حصہ سوم۔ روحانی خزائن جلد اوّل صفحہ 195-194)

اب یہ فقرہ بھی سمجھانا ہے لازماً کیونکہ عموماً جو سننے والے ہیں علمی لحاظ سے خواہ کسی درجے پر واقع ہوں فطری لحاظ سے اس فقرے کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو انسان کو اس مضمون کے لئے پیدا ہی نہ کیا جاتا اور چونکہ آنحضرت ﷺ ظاہری علم کے بغیر ہم سب میں سانجھے ہیں اور شریک ہیں یعنی ہمارے ہیں اس لئے علم کا کوئی پردہ بیچ میں حائل نہیں ہے۔ آپؐ کی ذات کو سمجھنے کے لئے وہ جو خدا سے علم پاتا ہے وہ علم پا کر آگے بتاتا ہے اور اگر غور سے سنا جائے یا مزید محنت سے سمجھایا جائے تو سمجھ آنے والی بات ہے۔ اس کا ظاہری علم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر چونکہ ظاہری علم کے بغیر یہ باتیں بیان نہیں ہوتیں اس لئے کھولنی پڑتی ہیں۔

پس اب دیکھیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام کیا فرما رہے ہیں۔ ''شجرہ فطرت انسانی اصل میں توسط اعتدال پر واقع ہے'' حقیقت کے اعتبار سے جو خدا تعالیٰ نے انسان کو صفات عطا فرمائی ہیں ان صفات میں آغاز میں اعتدال تھا اور وسطی طور پر واقع ہوئی تھیں۔ ان میں کوئی انتہا پسندی نہیں تھی۔ کسی انتہا کی طرف جھکنا فطرتاً نہیں تھا، اگر یہ ہوتا تو **یولد علی الفطرۃ** کا معنی سمجھ میں آتا کہ کیا ہے۔ ہر انسان کو اللہ نے فطرت پر پیدا کیا ہے جو قرآن کریم فرما رہا ہے۔ یہ تقاضا کرتا ہے کہ اس میں اعتدال ہو۔ ورنہ اگر خدا نے فطرت میں بے اعتدالی رکھی ہوتی تو پھر کوئی اعتدال والی

تعلیم انسان قبول کرنے کے اہل ہی نہ رہتا۔ اس لئے بے اعتدالیاں ہوتی ہیں تو بعد میں لوگ بنا دیتے ہیں۔ فطرت کو آغاز میں اعتدال ہی عطا ہوا ہے۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں۔ **کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ اور ینصرانہ** ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ ہر پیدا ہونے والا فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ **فابواہ یھودانہ او ینصرانہ** پر اس کے ماں باپ ہیں جو ان میں سے کسی کو یہودی بنا دیتے ہیں، کسی کو نصرانی بنا دیتے ہیں یعنی یہ جو تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں یہ انسان کی پیدا کردہ تبدیلیاں ہیں۔ اب صرف "**یھودانہ**" اور "**ینصرانہ**" کا ذکر فرمایا اور مسلمان بنا دیتے ہیں کا کوئی ذکر ہی کوئی نہیں۔ اس میں کیا حکمت ہے؟ کسی اور مذہب کا بھی ذکر نہیں فرمایا۔ پہلی حکمت تو یہ ہے کہ دو انتہاؤں کی اس سے بہتر مثال نہیں ہوسکتی کہ یا یہودی بنا دیتے ہیں یا عیسائی بنا دیتے ہیں۔ فطرت وسط میں واقع ہوئی ہے۔ اس کو ایک طرف کھینچ لو تو یہودیوں کی طرح تشدد اور سختی اور انتقام اور غیظ و غضب پر زور ہو جائے گا اور وہاں اسی مرکز سے ہٹا کر دوسری طرف کھینچ لو تو عیسائیت کی نرمی اور عفو اور درگزر یہاں تک کہ ایک گال پہ تھپڑ مارے تو دوسری گال پیش کر دو کی تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔ تو درمیان میں واقع ہے تو دونوں کو کھینچا گیا ہے نا۔ اس لئے اس کلام محمد مصطفیٰ ﷺ میں بھی ایک حیرت انگیز توازن اور اعتدال واقع ہے۔ پھر یہ کہ فطرت کو تو اسلام فرمایا گیا ہے۔ قرآن کریم میں بھی اور رسول کریم ﷺ کی طرف سے بھی۔ تو ماں باپ تو مسلمان نہیں بناتے خدا نے مسلمان بنا کے بھیجا ہے۔ اس لئے اس کا مسلمان کا بننا ایک فطری بات ہے۔ اس کے ساتھ تو وہ پیدا ہوا تھا۔ اس لئے اسلام کی تعریف فطرت سے باندھی گئی ہے اور وہی تعلیم ہے جو درحقیقت انسان کی فطرت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے غیر مبدل ہو جاتی ہے۔

اگر فطرت انسانی سے اسلام کی تعلیم کامل طور پر نہ جوڑی جاتی تو زمانے کے بدلنے سے اس تعلیم کا بدلنا لازم ہو جاتا۔ اگر یہ اعتدال اور وسط پر واقع نہ ہوتی جس کا حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ذکر فرمایا اور آنحضرت ﷺ اس سے بہت پہلے اس کو مثال دے کر ظاہر فرما چکے ہیں تو پھر یہ غیر زمانی تحریک نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ جب اعتدال پر چیز نہ رہے تو اسے استقامت نہیں رہتی اور یہ مضمون میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ تو اسلام کا توسط پر واقع ہونا ایک طبعی امر ہے۔ اگر انسان، ہر پیدا ہونے والا فطرت پر پیدا کیا جائے تو لازماً اسلام پر پیدا ہوا ہے اور اگر کوئی فطرت کو قائم رکھے، اگر جو

خدا کی ودیعت ہے اس امانت میں ایک ذرہ بھی فرق نہ آنے دے تو پھر آنحضرت ﷺ کے متعلق یہ فرمانا کہ وہ تو از خود ہی بھڑک اٹھنے کے لئے تیار بیٹھا تھا مراد یہ ہے کہ جو کچھ پایا تھا خدا سے پایا تھا مگر اس کی حفاظت کی تھی، اس اعتدال کو قائم رکھا تھا۔ اس توازن پر ہمیشہ قائم رہا اور یہی تو وحی کا مقصد تھا کہ تمہیں توازن عطا کرے جس توازن کو تم کھو بیٹھے تمہیں دوبارہ نصیب ہو وحی کی بدولت آسمان کا نور تمہیں پھر ان نوری اقدار پر قائم کر دے جن اقدار سے تمہارے سفر کا آغاز ہوا تھا تا کہ تمہارا انجام بھی اسی پر واقع ہو۔

پس وہ رسول ﷺ جس نے آغاز ہی سے اپنی ساری زندگی اس اعتدال سے سرمو بھی فرق نہ کیا ہو اس کے متعلق یہ فقرہ کیسا خوبصورت اور کیسا برمحل ہے ایک ادنیٰ بھی مبالغہ نہیں کہ یہ نور تو اپنی ذات میں بھڑک اٹھنے پر تیار بیٹھا تھا یعنی کامل اعتدال پر تھا اور تھا ہی نور۔ پھر اس پر جب شعلہءِ نور اترا ہے تو نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ بن گیا اور اس کمال کا نور پھوٹا ہے کہ سارے عالم کو روشن کر دیا۔ اس درجے کی اس میں شدت پیدا ہوئی ہے کہ خدا نے اسے سِرَاجًا مُّنِیْرًا (الاحزاب: 47) کے طور پر تمہارے سامنے پیش کیا مگر اس نور کی طرف سفر کیسے ہوگا۔ محض تعریفوں کے ذریعے نہیں بلکہ ان صفاتِ حسنہ کو اپنانے کی کوشش کے ذریعے، وہاں پہنچ کر تعریف کی حد ختم ہو جاتی ہے۔ پھر تعریف کی سچائی کی حد شروع ہوتی ہے۔

ایک انسان کسی کو دیکھ کر کہہ سکتا ہے واہ واہ کیسا اچھا ہے، کیسا مضبوط ہے، کیسا طاقتور ہے لیکن اگر وہ ہونٹوں کی تعریف ہے تو ویسا بننے کی کوشش نہیں کرتا کیونکہ اس میں محنت درکار ہے۔ بہت مشقت کا بعض دفعہ سامنا ہوتا ہے۔ ایک کرکٹر بننے کے لئے ہی آپ دیکھیں پوری زندگی بعض لوگوں کو وقف کرنا پڑتی ہے۔ وہ بچے جو تعریف کرتے ہیں دل کی گہرائی سے ان کو میں نے دیکھا ہے کرکٹ کی لو لگ جاتی ہے۔ بعض بچے مجھے دعاؤں کے لئے لکھتے ہیں کہ میرے لئے دعا کریں میں ایسا کرکٹر بنوں کہ بس دنیا میں کمال ہو جائے۔ وہ بچپن سے ہی تصویریں بھی کرکٹ کی بناتے ہیں، دیکھتے بھی ہیں، نام بھی ان لوگوں کے اکٹھے کرتے ہیں جو کرکٹ میں اچھے ہوا کرتے تھے۔ کتابیں وہ پڑھا کرتے ہیں جن میں کرکٹ کے ریکارڈ ہوتے ہیں۔ اب چھوٹی سی، معمولی سی کھیل ہے لیکن جو سچی تعریف کرنے والا ہے وہ صرف زبان سے عاشق نہیں ہوتا، دل سے اور عمل سے عاشق ہو جاتا ہے۔

بس یہی حال نور بننے کا ہے۔ کسی ایک صفت کو اگر آپ اچھا سمجھیں اور واقعۃً دل کی گہرائی سے اچھا سمجھیں تو اسے اپنانے کی لگن لگ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے براہ راست ہم ان صفات کو دیکھتے ہیں اور سنتے ہیں۔ مگر یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ خدا کی جو صفات ہم سے بہت ہی بالا، بہت ہی دور واقع ہوئی ہیں جہاں تک انسانی عقل کا تعلق ہے، نزدیک ہیں سمجھنے کے اعتبار سے، دور ہیں اپنانے کے اعتبار سے۔ نزدیک ہیں اس اعتبار سے کہ خدا نے خود انہیں ہم پر ظاہر فرما دیا۔ دور ہیں اس اعتبار سے کہ ظاہر ہونے کے باوجود ہم ان کی کنہہ کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس سفر کو آسان کرنے کے لئے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو نور کی مثال بنا کے دیا گیا۔ فرمایا یہ دیکھ لو۔ اس طرح میرا نور ایک انسان میں اپنے کمال کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ یہ یہ باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ یہ اخلاق اپنانے پڑتے ہیں۔ یہ اعتدال واقع کرنا پڑتا ہے اپنی طبیعت میں۔ یہ تم کرو تو تم بھی ویسے ہی ہو جاؤ گے۔ یہ ایک فرضی دعویٰ نہیں۔ یہ دعویٰ اس لئے بھی ضروری تھا کہ شرک کا کوئی شائبہ بھی اسلامی تعلیم میں باقی نہ رہے۔ اگر خدا تعالیٰ یہیں بات ختم کر دیتا کہ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ اور مَثَلُ نُوْرِهٖ آگے بات محمد رسول اللہ ﷺ پر جا کے کھڑی کر دیتا تو دنیا میں ایک اور قسم کا شرک پیدا ہوتا کہ محمد رسول اللہ ﷺ ہی ہیں جو صفات باری تعالیٰ سے ایسی یگانگت رکھتے تھے کہ انہیں اپنا سکتے تھے اور کوئی بشر ایسا نہیں جو ایسا کر سکے۔ تو وہ اپنی ذات میں خواہ آپ خدا کا شریک نہ بھی کہیں مگر شرک کا ایک مضمون ضرور دماغ میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

قرآن کریم جو حکیم کتاب ہے اور روحانی طب میں اس سے اعلیٰ درجہ کی مرض شناس کتاب اور کوئی واقع نہیں ہوئی، کبھی پیدا نہیں ہوئی یعنی انسان کو کبھی عطا نہیں ہوئی۔ اس آیت کے معا بعد فرماتا ہے۔ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا نور ایسی مثال نہیں تھی کہ تم اپنا نہ سکو۔ اس غرض سے نہیں تھی کہ اسے انسانوں سے الگ کر کے دکھایا جائے۔ اس غرض سے تھی کہ انسان کو بتایا جائے کہ تمہاری صلاحیتیں کیا کیا ہیں، تمہاری رسائی کہاں کہاں تک ہے۔ تمہی میں سے وہ شخص پیدا ہوا ہے یعنی محمد رسول اللہ ﷺ جنہوں نے نور کی تحصیل میں یہ کمال دکھا دیا ہے۔ درجہ کمال کو پہنچ گیا ہے اور تم اگر چاہو تو اس نور کی پیروی سے اسی طرح نور سے حصہ پا سکتے ہو اور صرف تعلیم نہیں دی فرمایا یہ نور جو ایک دل پر اترا تھا، جس دل میں جلوہ گر ہوا تھا اب دیکھو کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے فیض سے اور آپؐ کی

پیروی کی برکت سے کتنے نوروں میں بدل گیا ہے۔

فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وہ ایک گھر میں نہیں رہا وہ تو اب گھر گھر میں روشن ہو گیا ہے۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗۤ (الفتح:30) محمد رسول اللہ ﷺ اور ان کے جو ساتھی تھے جو واقعۃً معیت رکھتے تھے یعنی صحبت صالحہ سے فیض پاتے تھے ان کے دل بھی تو دیکھو وہ بھی تو روشن ہو رہے ہیں۔ ان کے دلوں سے بھی تسبیحات بلند ہو رہی ہیں اور خدا نے چاہا ہے کہ ان کے دلوں کو اس کی برکت سے بلند کر دیا جائے۔ ان گھروں کو بلند کر دیا جائے جن میں وہ نور روشن ہے اور سِرَاجًا مُّنِیْرًا کا جو وہ مضمون تھا ان کا اس بلندی سے تعلق ہے۔ نور جو وسیع طور پر فیض رساں ہو وہ چھوٹی حالت میں رہ کر نہیں ہو سکتا۔ اسے لازماً رفعت اختیار کرنی ہوگی کیونکہ جتنی بلند چیز ہو اتنا ہی اس کے نور سے دنیا فیض یاب ہو سکتی ہے۔ بعض دفعہ ہم جب بجلیاں نہیں ہوتی تھیں ہم لالٹین کو یا عام چراغ کو زمین پر رکھتے تھے تو وہی کمرہ اندھیرا لگتا تھا پھر جب اچھی طرح دیکھنا ہو تو اسے ہاتھ سے بلند کر کے اونچا کر کے دیکھتے تھے تو سارا کمرہ جگمگ کرنے لگتا تھا۔ تو محمد رسول اللہ ﷺ جو سِرَاجًا مُّنِیْرًا فرمایا گیا ہے اس پہلو سے بھی فرمایا گیا ہے کہ یہ اتنا بلند ہو گیا اس نور کی برکت سے جو خدا اس نور پر نازل فرمایا اور یہ دونوں مل گئے۔ اتنا رفع اور بلند ہو گیا کہ وہ سِرَاجًا مُّنِیْرًا کی طرح کل عالم پر چمکنے کی اہلیت پا گیا اور کل عالم اس سے فیض یاب ہونے کی صلاحیت اختیار کر گیا اور اس نے اس حسن کو اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے زمانے میں چمک کر دوسروں کو ایسی ہی صفات عطا کر کے ثابت کر دیا کہ نوروں میں سے سب سے وسیع تر یہ محمد رسول اللہ ﷺ تھے۔

اس کثرت سے اپنے معیت میں بسنے والوں کو اپنے نور کی شان عطا کرنے والا دنیا میں کبھی کوئی نبی نہیں پیدا ہوا۔ آپ تاریخ کا مطالعہ کر کے دیکھ لیں۔ اپنی زبان سے نہیں ان کتابوں کی زبان سے مطالعہ کر کے دیکھ لیں۔ بدھ نے کتنے بدھ پیدا کئے یا اپنے جیسے عقل کل جس کو وہ کہتے ہیں عقل کل تو صرف خدا کے لئے میرے نزدیک استعمال ہو سکتا ہے لیکن اپنی طرح عقل والے کتنے اور پیدا کیے تھے۔ موسیٰؑ نے ہارونؑ کے سوا کون سا پیدا کیا تھا جو اس سے مشابہ ہو اور وہ بھی دعا مانگ کے لیا تھا۔ اپنی ذات میں تو ہارونؑ میں وہ روشنی نہیں تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے سے ملتے جلتے کتنے حواری پیچھے چھوڑے۔ مگر محمد رسول اللہ ﷺ کی شان دیکھو کہ کتنا جلدی جلدی اپنے جیسے ہی اور نور

دوسروں کے سینوں میں روشن کرنے شروع کر دیئے، گھر گھر میں وہ شمعیں جلنے لگیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَ یُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ ان گھروں میں جن کے متعلق خدا نے، تقدیر نے فیصلہ کر دیا ہے کہ ان گھروں کو بلند کیا جائے گا۔ وَ یُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ اور ان میں اس کا نام یاد کیا جائے گا اور نام یاد رکھا جائے گا۔ دوسرا معنی ہے تُرْفَعَ وَ یُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ اس کا نام بلند کیا جائے گا اور نام یاد رکھا جائے گا۔ مگر گھروں کی بلندی تو ناموں کی بلندی سے ہی ہے۔ جس گھر میں نام بلند ہو وہ گھر بلند ہو جایا کرتا ہے۔ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا اس میں وہ لوگ جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھی ہیں وہ خدا کی تسبیح کریں گے یا کرتے ہیں بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ صبح بھی اور شام بھی۔ تو وہ نور کیسے حاصل ہوتا ہے۔ تسبیح الٰہی سے، ذکر الٰہی سے، خدا کا ذکر بلند کرو اس کی تسبیحات بلند کرو، صبح بھی کرو، شام بھی کرو تو تمہیں اس نور سے حصہ ملنا شروع ہو جائے گا۔ جو آنحضرت ﷺ کا وہ نور ہے جو خدا نے مثالاً بیان فرمایا ہے ورنہ اللہ کے نور کی حقیقت کو کوئی دنیا میں نہیں جانتا۔ اب چونکہ وقت زیادہ ہو گیا ہے باقی انشاء اللہ آئندہ خطبے میں۔